بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

یومِ آزادی اور قانون کی بالادستی

شاید بیکن نے کہا تھا کہ تھوڑا علم الحاد پر منتج ہوتا ہے، جبکہ گہرا علم آدمی کو خدا کے پاس لے جاتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ انسانی سوسائٹی کی حالیہ مسلسل پریشانیوں نے بھی، حساس انسان کو خدا کی طرف مائل کر دیا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جس نے برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں کا رخ پاکستان کی طرف موڑا تھا چنانچہ ایک ایسے پاکیزہ اجتماعی نظام کے لئے جو انسان کو انسان کی غلامی سے اور بدی کی یورش سے نجات دلاتا ہے، برصغیر کے مسلمانوں نے ہر ممکن جدوجہد کی۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے پاکستان کے قیام کے لئے جو قیمت ادا کی ہے وہ شاید ہی کسی دوسری قوم نے بیسویں صدی میں اپنی آزادی کے لئے ادا کی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری قوموں نے آزادی کی جنگ کو جیتنے کے لئے جانبازی کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں لیکن تاریخی طور پر یہ دعویٰ بھی بے بنیاد نہیں ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے بڑی جوانمردی کے ساتھ وقت کے ہاتھوں پے بہ پے مصیبتوں اور ذلتوں کو صرف اس لئے برداشت کیا کہ وہ پاکستان میں ایک ایسے خدائی قانون کی بالادستی دیکھنا چاہتے تھے جو ان کو ان کے وقار اور عزتِ نفس کا تحفظ دے سکے اور وہ سکون و اطمینان سے اپنی انفرادی اور اجتماعی شخصیت کو سنوار سکیں۔ اس قانون کی بالادستی کو دیکھنے کے لئے مسلمانوں نے سالہا سال تک برطانوی سامراج کے حاکمانہ غرور کے ہاتھوں مسلسل زخم کھائے، ان کا احساسِ وقار مجروح ہوا اور دامنِ ناموس تار تار۔ لیکن ان کا یہ ایمان کہ موجودہ وقت میں انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خدا کا عطا کردہ قانون ان کی عزت و آبرو کا محافظ ہے، انہیں محمد علی جناح جیسے اصول پسند، باوقار اور راست باز قائد کے پاس لے آیا، چنانچہ وہ مسلمانوں کی عقیدتوں اور تمناؤں کا مرکز بن گئے۔ مگر افسوس کہ پاکستان بننے کے بعد موت نے انہیں جلد ہی ہم سے جدا کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ قانون کی بالادستی

کو قائم کرنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ محترمہ فاطمہ جناح کا کہنا ہے کہ قائد جن تمناؤں کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں ان میں مسئلہ کشمیر کے ساتھ ساتھ دستور کا مسئلہ بھی تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہماری اجتماعی زندگی میں مختلف اسباب کی بناء پر اللہ کا قانون نافذ نہ کیا جا سکا، چنانچہ لاقانونیت نے مختلف شکلوں میں جنم لیا۔ جس کا سب سے پہلا حملہ انسانی وقار پر تھا چنانچہ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ لوگوں کے دل دہل گئے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جنہوں نے اخلاص اور دیانت سے قائد کا ساتھ دیا تھا جھوٹ کے فروغ پر یہ کہہ اٹھے "انصاف، اخلاق اور صحافت اس کا جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے"[۱] ان حالات کو دیکھ کر اہل درد بار بار شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتے رہے کہ اگر آج محمد علی جوہر، اقبال، اشرف علی تھانوی، محمد علی جناح، شبیر احمد عثمانی، بہ نفس نفیس ہم میں موجود ہوتے تو ہماری موجودہ حالت یقیناً ان پر گراں گذرتی، اور انہیں یہ دیکھ کر رنج ہوتا کہ رشوت، تشدد، ڈکیتی، قتل و غارت اور بد اخلاقی نے کس وسیع پیمانے پر ہماری روحانی اور قانونی قدروں کو نقصان پہنچایا ہے۔ ہم کئی بار یہ لکھ چکے ہیں[۲] کہ اسلامی تہذیب و تمدن کا بنیادی نقطہ خدا اور بندے کا باہمی رشتہ ہے۔ نیز یہ کہ جوں جوں آدمی کے دل میں خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس بڑھتا جائے گا وہ اسی قدر اجتماعی زندگی میں بہتر کردار ادا کر سکے گا۔ لیکن جب یہ انفرادی رشتہ اجتماعی شکل اختیار کرتا ہے تو وہ شریعت کے مقدس سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا امتیازی وصف جمہوریت یا پارلیمنٹری سسٹم نہیں بلکہ خدائی قانون کی بالادستی ہے۔ ایسا قانون جس کی بنیاد کامل عدل و انصاف پر ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ دنیا کے بعض ملکوں نے نہ صرف نظریاتی طور پر قانون کی بالادستی کو تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی حکمرانی کا سکہ بھی رائج کر کے دکھا دیا ہے۔ لیکن ہمیں اس بارے میں تامل ہے کہ وہ پوری سوسائٹی کو عدل و انصاف بھی فراہم کر سکا ہے، مثلاً برطانیہ میں جہاں قانون کا بے حد احترام کیا جاتا ہے، ۱۹۴۸ء سے پہلے قانون برطانیہ کے ہر شہری کو اس کا جائز حق نہیں دلا سکا۔ حالانکہ صدیوں تک مشرق کی دولت کا رخ برطانیہ کی طرف رہا ہے۔ لیکن ہم یہاں عدل و انصاف کے حامل جس قانون کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہیں، اس کا تصور سوسائٹی کے کسی با اختیار گروہ نے نہیں بلکہ وحی نے دیا ہے اور جس کو عملی شکل پیغمبر کے بعد انسانی عقل دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے قانون میں وحی اور عقل دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

۱۔ حمید نظامی، نشان منزل، ص ۲۳ (لاہور)
۲۔ ۔ ۔ اسوۂ فکر و نظر ۱۹۷۷ء

اور وہ سوسائٹی کے ہر فرد کی عزت و آبرو اور آزادی کا محافظ ہے۔ اور ان لوگوں کے حقوق کا نگہبان ہے جو کسی وجہ سے اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور بود و باش کے حسن و قبح کا اندازہ اس بات سے لگایا جائے گا کہ وہاں قانون نے عملی طور پر انسانی وقار کو کس حد تک سہارا دیا ہے، اور اخلاق اور روحانی قدروں کی ترویج کے لئے اس نے انسانی سوسائٹی کو کہاں تک تیار کیا ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی کا دوسرا نمایاں وصف یہ ہے کہ ہم زندگی اور قانون کو مقدس گردانتے ہیں۔ تقدس کا یہ تصور مذہب سے وابستہ ہے۔ سیکولر نظامِ حیات سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں، جہاں قانون کا بڑا احترام کیا جاتا ہے، زندگی اپنا تقدس کھو چکی ہے۔ خود ہمارے ہاں زندگی کی بے حرمتی پر جو لوگ خوش ہوتے ہیں، اس کی وجہ ان لوگوں کی بیمار روحیں ہیں جنہوں نے خدا سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔

قانون کی یہی بالادستی ہے جس کو قائم کرنے کے لئے دنیا میں بڑے بڑے پیغمبر، فلسفی اور مصلحین آئے اور اسی کے قیام کا تہیہ پاکستانی قوم نے کیا تھا۔ قانون کی حکمرانی سے مراد یہ ہے کہ لوگ پر امن فضا میں اپنی صحت مند روایات کے مطابق آزادی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر سکیں، ان کے دل و دماغ میں خوف و ہراس کے کسی تصور کا گذر نہ ہو، اور کوئی آدمی قانون کی دسترس سے باہر نہ ہو۔

یوم آزادی کے اس موقع پر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ہم اپنے ملک میں خدائی قانون کی بالادستی کو قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارے ہاں قانون کی جو تعلیم دی جا رہی ہے کیا وہ ہمارے بلند نصب العین سے ہم آہنگ ہے؟۔ بہت سے لوگ اس بات کو شاید رجعت پسندی سے تعبیر کریں، لیکن انسانی تجربات نے ہمیں بتایا ہے کہ بلند نصب العین کو اختیار کئے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، اور بلند نصب العین کا تصور ہماری رائے میں صرف خدا کی ذات ہی سے وابستہ ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو انسان کو اس کی پستیوں سے اٹھا کر حسن و کمال کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ ان بلندیوں تک پہنچنے کے لئے آج ہمیں خود اپنا محاسبہ کرنا ہوگا۔ آج یوم آزادی کا ہم سے یہی مطالبہ ہے۔ فھل من مدکر؟